ساجدہ حبیب

یادوں کے الاؤ

پاک سوسائٹی
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساجدہ حبیب

یادوں کے سائے

اب کی بار جو ساون کی جھڑی لگی تو بے اختیار دل چاہا کہ کہیں اندرون ملک پرواز کی جائے مگر کہاں؟ اور کدھر؟ فی الوقت یہی مسئلہ زیرِ غور تھا چونکہ کراچی سے خیبر تک تقریباً" سارا علاقہ اس چنڈال چوکڑی کے قدموں تلے روندا جاچکا تھا۔ جو اپنے انتہائی وسیع خاندان کے صدقے سارا پاکستان قیام وطعام کے خرچ کے بغیر دیکھ چکی تھی اور اس کے لیے ہم سب اپنے پردادا سر عبداللہ خان کے بے حد مشکور و ممنون تھے' جنہوں نے اس چمن کی وسیع پیمانے پر آبیاری کرکے اسے ملک کے گوشے گوشے تک پھیلا دیا تھا۔

باہر برستی بوندوں کا مدھم اور بدھر شور تھا جبکہ "نشاط ہاؤس" کے اندر اس ککھوڑ فیملی کی نئی نسل کی بے ہنگم آوازوں کا شور تھا۔ جو چیخ چیخ کر اپنی اپنی پسند کی جائے وقوع کا اعلان کررہے تھے۔ اس گینگ کے لیڈر اور بڑے تایا کے فرزند ارجمند کیپٹن کیانی فرش پر دھرنا مارے آنکھیں بند کیے اپنی انگلیوں پر بقایا پی لیو کا حساب لگاتے ہوئے ان سب کو دل ہی دل میں ہزاروں صلواتیں سنا رہے تھے۔

اظہر نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ سیاسی لیڈر کے اسٹائل میں دایاں ہاتھ اٹھا کر لہرایا اور با آواز بلند بولا۔

"ثروت کے ننھیال چلتے ہیں۔ وہاں ساہیوال میں آم کے باغ۔۔۔"

مگر علی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہرگز نہیں۔ گوشت میں بوٹیاں گن گن کر پکاتے ہیں وہ لوگ۔ خالی آم کھا کر جیو گے تم۔" اور دور بیٹھی ثروت تلملا کر رہ گئی۔

"تو پھر فخری کے ددھیال۔"

"تم اپنا چانس نہ مس کرنا۔" علی زور سے بولا۔ "دوسروں کے بارے میں بھی سوچ لیا کرو۔"

"مرو تم سب۔" اظہر کو غصہ آگیا۔

"ہرگز نہیں۔" علی چلایا۔ "اس طرح تو ہم سب سیدھے جنت میں پہنچ جائیں گے اور تم اسی دکھ بھری دنیا میں سڑے رہو گے۔"

"سنو پاگلو۔" یکایک کیپٹن کیانی گیان و دھیان کی دنیا سے واپس تشریف لے آئے۔ "تم لوگ اب کی بار نواب ماموں کے ہاں کیوں نہیں چلے جاتے۔"

یہ بہترین تجویز تھی۔ چنانچہ فوراً" عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہما اور صبا بھی اب توجہ سے گفتگو میں حصہ لینے لگیں' ورنہ اب تک تو ہم دونوں مسلسل ماریہ کے بارے میں سوچ کر پریشان ہورہی تھیں۔ جس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک سیڑیل پروفیسر کے ساتھ ہوگئی تھی اور ہم دونوں پریشان تھیں کہ نہ جانے بے چاری کے شب و روز کس طرح گزرتے ہوں گے؟

اب باقاعدہ گول میز کانفرنس شروع ہوئی۔ تایا اور چچاؤں کی باقی اولادوں کو بھی پکارا گیا اور کانفرنس میں یہ بات طے پائی کہ اب کی بار نواب ماموں کے ہاں ہلا بولا جائے۔ وہ لوگ آؤٹ آف وے ہونے کے باعث ابھی تک ان لوگوں کے شرفِ میزبانی سے محفوظ تھے۔ بزرگوں سے یہ قرارداد ماقاعدہ طور پر پاس کروانے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعد تیاریاں شروع ہو گئیں۔ آخری لسٹ مرتب ہونے تک صرف ثروت، فخری، ہما، صبا، اظہر، علی اور کیپٹن کیانی کے نام رہ گئے۔ باقی لوگ خدا جانے نواب ماموں سے کسی دشمنی کی بنا پر صاف مکر گئے یا کوئی اور بات تھی۔

نواب ماموں میری امی کے چچا زاد بھائی تھے۔ راجپوت ہونے کے باعث ان کا نام ہمارے خاندان کے شجرۂ نسب میں چوتھے نمبر پر شمار ہوتا تھا۔ ماشاءاللہ آدھی درجن اولاد کے باپ تھے اور آزاد کشمیر کے نئے اور جدید شہر میرپور میں رہائش رکھتے تھے۔ جو منگلا ڈیم جیسے وسیع منصوبے کے تحت پرانا میرپور شہر زیرِ آب آجانے کے باعث بالا گلا کی پہاڑیوں میں بس گیا تھا۔ سنا تھا کہ وہاں اونچائی پر واقع ان کی کوٹھی کی چھت سے منگلا جھیل کا نظارہ بخوبی کیا جا سکتا تھا۔ اور یہ بات ہم جیسے پانی کے دیوانوں کے لیے باعثِ اطمینان تھی کہ چلو تفریح کا کوئی پہلو تو ایسا ضرور ملے گا جو سو فیصدی حسبِ منشاء ہوگا۔ کیپٹن کیانی ایک عرصے تک وہاں کہیں قریب ہی پوسٹ پر رہ چکے تھے۔ وہ آتے جاتے نواب ماموں کے ہاں ضرور ٹھہرا کرتے اور اکثر ہمیں ان کی میزبانی کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ اب بھی ان کی پوسٹنگ منگلا میں تھی۔ لہٰذا انہوں نے ہمیں اپنی خاص نگرانی میں بحفاظت وہاں تک پہنچانے کا مژدہ سنایا۔ وہ پچھلے بیس منٹ سے مجھے مسلسل صبا سمجھ کر بات کر رہے تھے۔ حالانکہ میں تو ہما تھی اور میری ہم شکل جڑواں بہن صبا سکندر راجہ چائے بنانے گئی ہوئی تھی۔ جب ذرا دیر بعد صبا چائے لائی اور اس نے اپنے دستِ نازک سے پیالی انہیں پیش کی تو جناب نے پہلے ہی گھونٹ پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہوئے فرمایا۔ ”واہ ہما بی بی! کیا مزے کی چائے بنائی ہے۔“

صرف ایک کیپٹن کیانی پر ہی کیا موقوف۔ خاندان بھر میں ہر ایک فرد کو ہمیں پہچاننے میں دقت پیش آتی۔ چونکہ بقول علی کے اللہ پاک نے اپنی قدرت کو تسلیم کروانے کے لیے اس اعلا مہارت سے دو شکلیں ایک جیسی بنائی تھیں کہ بس پتہ ہی نہ چلتا کہ کون کیا ہے؟ یا کون سی ہستی ہے؟ جبکہ اظہر کے فلسفے کے مطابق یہ ربِ عظیم کی مصلحت تھی۔ جس نے ایک صورت کا بلاک بنایا مگر ایک بلاک سے دو چہرے بنا کر ہمیں بچت کا سنہری اصول سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

اب ان لوگوں کی مرضی کہ وہ قدرت کو جو چاہیں الزام دے لیں۔ بہرحال فطرت نے مجھے کچھ انفرادیت تو ضرور بخشی تھی۔ ان میں سے ایک تو وہ سیاہ تل تھا جو میرے شانے سے ذرا نیچے جما ہوا تھا۔ حالانکہ جب میں ہائی نیک پہن لیتی تو امی جان بھی آوازیں دے کر پوچھا کرتیں۔

”ہما ہو یا صبا؟“ اور دوسری میری اپنی فطرت کہ سارے جہاں کا درد میرے جگر میں تھا جبکہ صبا خالصتاً اپنی ذات تک محدود رہنے والی لڑکی تھی۔

اور اب اس وقت بھی یہی بحث جاری تھی کہ نواب ماموں کے ہاں تعارف کراتے وقت ہما اور صبا کو علیحدہ علیحدہ قسطوں میں پیش کیا جائے گا۔ مبادا کوئی انہیں بھولی بھٹکی روح یا پھر انسان کا دوسرا جنم سمجھ کر بیہوش وغیرہ ہو جائے اور نتیجے کے طور پر سب کو بوریا بستر گول کرنا پڑے۔ (پہنچنے سے پہلے ہی)۔

سفر کا آغاز ذرا مناسب طریقے سے الوداعی کلمات اور سلامتی کی بے شمار دعاؤں کے ساتھ ہوا اور پہلے مرحلے میں ہم لوگ گرد جھاڑنے سلطانہ پھوپھو کے ہاں لاہور جا رکے۔ جہاں پہنچتے ہی اظہر اور علی کو چڑیا گھر دیکھنے کی پڑ گئی۔

سرِشام جب سب چڑیا گھر پہنچے تو وہاں ایک مرحلے پر ہمارے پیارے چچا زاد اور ماموں زاد علی اور اظہر کی پٹائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ہوا کچھ اس طرح کہ جوں ہی ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ ہماری نظر ایک نوبیاہتا جوڑے پر پڑی۔ شوہر موصوف اپنے دیو قامت وجود کے زیرِ سایہ اپنی نازک اندام دلہن کو لیے ایک ایک پنجرے کے پاس رک کر ہر ایک جانور کا شجرۂ نسب تفصیل سے سنا رہے تھے۔ اتفاق سے وہ لوگ الو کے پنجرے کے پاس رکے تو میں اظہر اور علی بھی وہیں پہنچ چکے تھے جبکہ دوسری طرف کیپٹن کیانی باقی لوگوں کو ساتھ لیے شیر کے پنجرے کے پاس کھڑے اس کا موازنہ اس شیر سے کر رہے تھے جو ایک بار آزاد کشمیر میں ایکسرسائز کے دوران ان کی یونٹ کے افراد سے ہیلو ہیلو کرنے آن نکلا تھا۔ ادھر میں ان کی گپ بازی پر یقین کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اظہر اور علی کی حرکات نوٹ کر رہی تھی۔

اظہر نے ایک ترچھی نظر اس جوڑے پر ڈالی اور ذرا اسٹائل سے علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”یار! ایک بات تو سمجھاؤ؟“

”پوچھو؟“ علی نے بزرگانہ اور تجربہ کار لہجے میں کہا۔

”یہ اکثر شوہر شادی کے بعد چڑیا گھر میں اپنی بیوی کو کیا دکھانے لاتے ہیں؟“

”بس اتنی سی بات ہے؟“ علی زور سے ہنسا۔ ”بھئی یہاں آنے والا ہر شوہر اپنی بیوی کو دکھاتا ہے کہ دیکھو ’یہ ہے اصلی الو۔‘“

یہ بات شوہر موصوف کے کانوں تک پہنچی۔ یکایک انہوں نے گھوم کر ایک غضب ناک نگاہ ہم تینوں پر ڈالی۔ وہ غرا کر آگے بڑھے۔ اظہر اپنی عینک بچا کر ایک طرف ہو گیا۔ اب علی زد میں تھا۔ اس سے پہلے کہ ان کا لہراتا ہاتھ علی کے سفید چہرے کو کوئی خوبصورت سا رنگ بخش کر گلنار کر دیتا۔ ان کی بیگم نے اپنے دستِ حنائی سے ان کا بازو پکڑ لیا اور شرمیلی آواز میں بولیں۔

”چھڈ دوی۔ کی پئے کر دے او۔“

ادھر سب سے پہلے اظہر نے دوڑ لگائی۔ تو ہمیں بھی خیال آیا کہ دوڑنے کی نعمت قدرت نے ایسے ہی موقعہ کے لیے بخشی ہے۔ لہٰذا ہم تینوں دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے۔ جہاں کیپٹن کیانی اپنے سے کم تعلیم یافتہ افراد کو زرافہ دکھاتے ہوئے بتا رہے تھے۔ ”چونکہ غیر مناسب لمبائی کے باعث اس کے سر اور پاؤں کے درمیان کا فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا یہ اپنے گھٹنوں میں جمع شدہ عقل استعمال کرنے سے قاصر ہے۔“

رات آٹھ بجے واپسی ہوئی تو سلطانہ پھوپھو کے ہاں ڈنر کا جان دار مرحلہ پیش آیا۔ جہاں ان کے سسرال والے بھی مدعو تھے۔ ان میں سے ایک خاتون ایسی بھی تھیں جو اپنی دخترِ نیک اختر کے لیے نہ جانے کب سے کیپٹن کیانی پر نظر رکھے ہوئی تھیں۔ چونکہ موصوفہ کو فوجی بہت پسند تھے۔ بہترین سسرالی انداز میں ملنے کے بعد بے شمار دعاؤں کے ساتھ انہوں نے پوچھا۔

”اور سناؤ۔ آج کل کس محاذ پر ہو؟“

”عشق کے۔“ دور بیٹھی فخری نے بے ساختہ کہہ دیا۔

”جمشید کیانی۔“ خاتون ان کا مبارک نام لے کر گویا ہوئیں۔ ”تمہارے خاندان کی ساری لڑکیاں کیا اتنی زیادہ گستاخ ہیں؟“

”نہیں۔“ وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولے۔ ”اس سے کم بھی ہیں۔“

اب فخری بیگم خوامخواہ تاؤ کھا گئیں اور نہایت سریلی آواز میں بولیں۔

”ہمیں برا بھلا کہنے سے آپ کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ بہت مشکل ہے۔“

خاتون ایک قہر کے عالم میں اٹھیں اور ہماری بدتمیزیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے واک آؤٹ کر گئیں۔ میں نے دیکھا کہ کیانی اب ایک

عمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ!
ایڈونچرس
اب دو حصوں میں شائع ہو گئی ہے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۳۲ اردو بازار کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

استغراق کے عالم میں بیٹھے سامنے رکھی پلیٹ کے پھولوں کو مسلسل گھور رہے ہیں۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"میں؟" وہ چونک کر بولے۔ "ہاں میں سوچ رہا تھا کہ عالمگیر سطح پر مشہور ہونے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟"

"خودکشی۔" کونے سے علی کی آواز آئی۔

"اللہ پلیز۔ اب کر بھی ڈالیے نا۔" اظہر نے خالص زنانہ آواز بنا کر کہا تو ہنستے ہنستے بقول صبا کے پھیپھڑوں میں بل پڑ گئے۔

اسی وقت سلطانہ پھوپھو اپنی صاحبزادی فرح کے ہمراہ پلاؤ کی ڈش اٹھائے اندر داخل ہوئیں اور ڈش میز پر رکھتے ہی ان کی تقریر شروع ہو گئی کہ آج ان کے بھائیوں اور بہنوں کی اس نامعقول اور ناخلف اولاد کی بدولت وہ عظیم خاتون ناراض ہو کر چلی گئیں۔ جو فرح کے رشتے کے لیے مسلسل چار ماہ سے آ رہی تھیں۔ فرح نے بطور احتجاج اعلان کر دیا کہ وہ صبح ہمارے ساتھ نہیں جائے گی۔

"نہ جاؤ۔" اظہر اطمینان سے بولا۔ اس کی کبھی بھی فرح سے نہ بنی تھی۔ "تمہارے نہ جانے سے کون سا کشمیر کے دریاؤں کا رخ بدل جائے گا۔"

فرح اپنی براؤن آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان لیے باہر چلی گئی۔ جب یہ طوفان کچن میں سلطانہ پھوپھو کے عین سر کے اوپر برسا تو وہ ہم لڑکیوں سے خصوصاً" اور لڑکوں سے عموماً" ناراض ہو کر جلدی سو گئیں۔ یوں اس ڈنر کے صدقے میں باقی سارا کام ہمیں کرنا پڑا۔

روشن صبح طلوع ہوئی اور ہم عازمِ سفر ہوئے۔ منگلا چیک پوسٹ پر پہنچ کر ہم نے بہت شور مچایا کہ ہم اوپر میس کے اس کمرے میں ضرور جائیں گے۔ جہاں اس راجپوت خاندان کے عظیم فرزند کیپٹن کیانی کا بسیرا تھا۔ وہ شو تو بہت مارتے تھے۔ ہم بھی ذرا ان کا STANDARD OF LIVING (معیارِ زندگی) دیکھنا چاہتے تھے۔ زیادہ تجسس اس بات کا تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں لڑنے والے پردلوا اور برما کی لڑائی میں جاپانیوں کے خلاف نبرد آزما ہونے والے دادا کے اس پوتے کا حال کس طرح گزر رہا ہے مگر وہ "پھر کبھی پھر کبھی" کی تکرار کرتے ہوئے ہمیں ہانک کر پل کے دوسری طرف لے گئے۔ جہاں اونچی نیچی پتھریلی پہاڑیوں کے اوپر نیا میرپور کھڑا اپنے شباب پر اترا رہا تھا۔

نواب ماموں یہاں لکڑی کی ایک مل کے کچھ زیادہ ہی بڑے افسر لگے ہوئے تھے کیونکہ اینٹ اور پتھر کے زمانے میں اس مکان کی تعمیر میں لکڑی کا ناجائز استعمال کیا گیا تھا۔ وہاں برسوں کے بعد ملاقات ہونے پر نہایت تپاک سے استقبال کیا گیا۔ ان کی غیر شادی شدہ اولاد سے فوراً" دوستی کر لی گئی جبکہ ان کے خاندان کے ایک تہائی افراد اس علاقے کے لوگوں کی روایت کے عین مطابق ترکِ وطن کر کے انگلینڈ میں مقیم شاہی خاندان کی مراعات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بدلے میں انہیں اپنی بے لوث خدمت سے نواز کر ان کے ملک کی ترقی کا باعث بنے ہوئے تھے۔

دو دن کے بے ہنگم اودھم کے بعد زندگی میں ذرا تناسب اور کچھ سلیقہ آیا تو کیپٹن کیانی بڑی خالہ کے ہاں اٹک خرد چلے گئے۔ چونکہ ان کی پی لیو ختم ہونے والی تھی۔ لہٰذا وہ خالہ کو خاص طور پر یہ "جواب شکوہ" پیش کرنے گئے کہ وہ گزشتہ برس ان کے ہاں بھلا کس وجہ سے نہ آ سکے تھے؟

ساون کی دوپہر تھی۔ فضا میں حبس کا تاثر نمایاں تھا جبکہ لیمن اسکوائش کے گلاسوں پر صاسکندر راجہ کے بلاوجہ رونے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ پچھلے چار گھنٹوں سے انہیں ماں کی آغوش بری طرح یاد آ رہی تھی اور علی ان آنسوؤں کو زیرِ بحث لاتے ہوئے یہ بتا رہا تھا کہ منگلا ڈیم جیسے آب رسانی کے عظیم منصوبوں کے پیچھے ان ہی جیسی عظیم خواتین کا ہاتھ ہے۔ دراصل یہ ان کے اشک ہی تو ہیں کہ جب جمع کیے گئے تو ڈیم بن گیا۔

دفعتاً" نواب ماموں کے گھر کی گیلری میں رکھا ٹیلی فون بج اٹھا۔ میں نے جا کر فون ریسیو کیا تو کسی مناسب تمہید کے بغیر ادھر سے پوچھا گیا۔

"کیپٹن کیانی مل سکیں گے؟"

"سوری۔" میں نے کہا۔ "وہ اس وقت مارکیٹ میں دستیاب نہیں۔"

"کہاں گیا ہے؟" نہایت بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

"جی۔ وہ ذرا اٹک گئے ہیں۔"

"کیا فرمایا؟ کہاں اٹک گئے ہیں؟"

اب یہ نہایت نامناسب سا سوال تھا۔ میں نے وضاحت کی۔ "وہ اٹک خرد گئے ہیں۔ جناب! کل تک لوٹ آئیں گے۔"

"عجیب انسان ہے۔" ادھر سے میرے تایا زاد کے بارے میں ایک نیا انکشاف کیا گیا۔ "کل اس کی چھٹی ختم ہے اور پرسوں بریگیڈ کمانڈر صاحب آ رہے ہیں' اسے کچھ ہوش نہیں۔" حالانکہ خود اس وقت ان کے حواس کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنا نام تک بتانا بھول رہے تھے۔

"وہ آئے تو اسے بتا دیں۔" گفتگو جاری رہی۔ "فوراً" رپورٹ کرے۔"

"جی بہت اچھا۔" میں نے کہا۔ "آپ کا اسمِ شریف؟"

حالانکہ مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ کہیں درود شریف نہ سنانا شروع کر دیں مگر ادھر سے فوراً" جواب آیا۔

"جانِ عالم کہتے ہیں مجھے۔" تیزی سے کہا گیا۔

"میجر جانِ عالم۔"

"بہت اچھا۔ کیپٹن کیانی کو پیام مل جائے گا۔"

میں فون بند کر کے آئی تو پہلا سوال صبا کی جانب سے آیا۔

"کون تھا؟"

"ساری دنیا کی جان۔"

"ارے میں سمجھ گئی۔" نواب ماموں کی بیٹی عرشی نے کہا۔ "میجر جانِ عالم ہوں گے۔ وہ اکثر کیانی بھائی کے ساتھ آیا کرتے ہیں۔"

اس کے بعد عجیب و غریب ناموں کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ شام کا ہلکا سا غبار پھیلا اور ہم لوگ حسبِ عادت آوارہ گردی کے لیے نکل پڑے۔

رات کو کیانی کا فون آیا تو میں نے رقت انگیز لہجے میں داستان کہہ سنائی۔ انہوں نے بڑے آرام سے جواب دیا۔ "پاگل ہے وہ۔"

میں حیران تھی کہ انہوں نے اپنے سے سینئر افسر کے بارے میں ایسا جملہ کہا ہے۔ جس پر کورٹ مارشل نہ سہی مگر ایکشن تو لیا جا سکتا ہے۔ جب میں نے اس خدشے کا اظہار کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر ایسی کوئی گڑبڑ ہو گئی تو دادا کی اولاد میں سے وہ دوسرا شخص تھا جو ایک عظیم روایت کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی مرضی کے خلاف فوج میں بھیجا گیا تھا تاکہ یہ لڑی نہ ٹوٹے۔ تو کیا ہو گا؟

لیکن پتہ چلا کہ وہ دونوں تو کورس میٹ ہیں۔ اب یہ ان کی قسمت کہ یار لوگ تو آگے نکل گئے جبکہ کیانی اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پروموشن کا امتحان صحیح طرح پاس نہ کر سکنے کے باعث فی الوقت اپنے شانوں پر تین عدد پھول فی شانہ سجائے رکھنے پر مجبور تھے۔

دوسری شام جب ہم کھانے کے بعد لمبی واک کے ارادے سے ذرا سج بن کر سکیڑ ایف ٹو کی لمبی اور شفاف سڑک پر نکلے تو سامنے سے ہم سب کے پیارے کیپٹن کیانی اپنے دادا کی طرف سے بخشی گئی سیکنڈ ہینڈ فوکسی میں آن موجود ہوئے۔ ساتھ میں ایک لمبا سا آدمی بھی تھا جو آدھی آستین کی بش شرٹ پہنے کسی تھیٹر کا ہیرو لگ رہا تھا۔

"یہ کون ہے؟" صبا نے حسبِ عادت سوال کیا۔

"آستین کا سانپ۔" اظہر نے جواب دیا۔

کیانی نے گاڑی گھر کے اندر پارک کی جبکہ وہ صاحب اسٹائل سے ایک بازو کھڑکی میں لٹکائے لڑکیوں کو گھورتے رہے۔

"راشد کہاں ہے؟" کیانی نے باہر نکلتے ہی نواب

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماموں کے فرزندِ ارجمند کا پوچھا۔
"غنڈہ ٹیکس وصول کرنے گیا ہے۔" علی نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔
"یار! میرا سامان گاڑی میں رکھو۔" کیانی شاید جلدی میں تھے۔ علی ان کا سامان لینے اندر چلا گیا اور وہ پبلک کے پرزور اصرار پر بیٹھنے پر مجبور ہوگئے۔ انہوں نے وہیں سے ہانک لگائی۔
"جان! یار ذرا آجاؤ' کچھ دیر ہے ابھی۔"
اور وہ جوان کی جان تھا' اپنے غصے کو دباتے ہوئے ہماری طرف بڑھا۔ "یار کیانی! گدھے ہو تم۔" اس نے ہم سب کا خیال کیے بغیر اس عظیم راجپوتی سپوت کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ "اتنا کام باقی ہے اور تمہیں تفریح کی سوجھی ہے۔"
"بیٹھو یار!" کیانی اطمینان سے بولے۔ "کون سی جنگ چھڑ گئی ہے۔ رات پڑی ہے درمیان میں۔ کام بھی ہوجائے گا۔"
وہ بڑی مشکل سے تشریف رکھنے پر آمادہ ہوئے تو کیانی کو تعارف کا خیال آیا۔ "یہ میجر جانِ عالم ہیں۔"
جواب میں وہ کچھ اس طرح شرمائے کہ ساری سہاگنوں کی شرمیلی مسکراہٹ ہیچ نظر آنے لگی۔ اظہر نے شرفِ میزبانی ادا کرتے ہوئے پوچھا۔
"2Ho پئیں گے آپ؟"
"سائنس اسٹوڈنٹ لگتے ہو؟" وہ مسکرائے۔
"جی ہاں۔" کیانی نے وضاحت کی۔ "نشتر میں ہے اور دوسرے سال میں۔"
"بڑی خوشی ہوئی مل کر۔" دوبارہ ہاتھ ملایا گیا۔
ان کے بار بار "دیر ہو رہی ہے" کہنے پر کیانی کو اٹھنا پڑا' ورنہ وہ تو ہر ہر لیور پر ایک نیا عشق کرنے کے عادی تھے اور اس بار یہ چانس مس ہوجانے کے باعث ایک مرثیہ سنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کے جاتے ہی حسبِ عادت بحث شروع ہوگئی۔
"کیسا ہے؟" صبا نے سوال کیا۔
"کوئی خاص نہیں۔" فخری نے کندھے اچکائے۔
"کوئی عام بھی تو نہیں۔" میں نے کہہ دیا۔
"کیوں؟" صبا نے پوچھا۔ "کیا خاص بات ہے اس میں؟"
"میجر جو ہے۔" فخری نے لقمہ دیا اور مجھے اس کی کمینگی پر ایک دم غصہ آگیا۔ کس طرح میری ایک کمزوری کو ایکسپلائٹ کر رہی تھی۔ کم بخت کو معلوم جو تھا کہ مجھے ذرا بڑی عمر کے سوبر لوگ پسند ہیں۔
علی نے عین اسی وقت ایک اہم انکشاف کر ڈالا کہ میں تو کسی کو دیکھ کر شاعری کرنے لگا ہوں۔
"گدھا تخلص رکھ لو۔ خوب جچے گا۔" اظہر نے مشورہ دیا۔
عرشی اندر سے اپنے کمزور بدن پر جھولتا لباس سنبھالتی ہوئی آئی تو اظہر نے دوبارہ با آواز بلند سرگوشی کی۔ "وہ تمہاری آزاد نظم آرہی ہے۔"
علی نے گھور کر اسے دیکھا۔ عرشی نے آتے ہی کھانے کے لیے پکارا۔ چونکہ آج نواب ماموں کے کشمیری خانساماں صمد بابا نے ایک خاص کشمیری ڈش "گشتابے" بنائی تھی۔ لہٰذا پورا سال ہاسٹل میں پتلی دال کھانے والا اظہار ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں پھلانگ کر ڈائننگ روم میں جا پہنچا۔
رات کو ہمیں بلاوجہ جاگ کر صبا کی تیمارداری کرنا پڑی۔ وہ باتھ روم میں بالٹی کے اوپر گر گئی۔ بس ذرا سا کونہ کیا لگا کہ آفت آگئی۔ سکندر راجہ کی دختر نے وہ بین بجائی اور موسیقی کے ایسے ایسے نئے سروں کو عالم وجود میں لائیں کہ تان سین کی روح بھی کانپ اٹھی۔
صبح چار بجے وہ مشکل سے نیند کی وادیوں میں کھوئیں تو میں اور فخری بھی کمر سیدھی کرنے لیٹ گئے۔
آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ عرشی نے بتایا کہ ارشد بھائی' اظہر اور علی کو لے کر منگلا گئے ہیں۔ کیپٹن کیانی نے انہیں بلایا تھا۔ ان کی اس بے ایمانی پر ہم لوگ تلملا کر رہ گئے۔ صبا نے جل کر انہیں ایک غیر مناسب سا خطاب دے ڈالا۔
شام کو ہم لان میں بیٹھے فخری سے اس کی دوست سائرہ کی محبت کی داستان سنتے ہوئے جب یہ مشورہ دے رہے تھے کہ حکومت کو محبت کرنے پر بھی ٹیکس

لگانا چاہیے' جسے دیکھو وہی کیے جا رہا ہے۔ تب ہی ارشد بھائی ہمارے دادا اور نانا کی ہونہار اولاد کو لیے آگئے۔ یہاں سے صرف نو کلو میٹر کے فاصلے پر سے آرہے تھے مگر لگتا تھا۔ چاند پر سے واپسی ہوئی ہے۔
وہ آتے ہی شروع ہوگئے۔ "بہت انجوائے کیا۔"
ان کی اس تکرار سے تنگ آکر صبا نے سوال کر ڈالا۔
"اور کون تھا وہاں؟"
"میجر جانِ عالم۔" اظہر نے بتایا۔ "واہ' ظالم غضب کا اسمارٹ لگ رہے تھے۔"
"اچھا۔" فخری حیرت سے بولی۔ "اور کیانی؟"
"بھئی وہ تو ہے ہی خوبصورت۔ آخر بھائی کس کا ہے۔" علی مسکرایا۔
"ہمارا کسی نے نہیں پوچھا؟" میں نے جانے کس جذبے کے تحت کہا۔
"ہاں۔ وہ میجر صاحب پوچھ رہے تھے کہ صبا کا کیا حال ہے؟ تو میں نے بتایا کہ وہ بالٹی پر گر گئی تھی۔"
"پھر؟" صبا کے لہجے کی بے تابی میں نے خاص طور پر نوٹ کی۔
"پھر وہ پوچھنے لگے کہ بالٹی کا کیا حال ہے؟"
"اخاہ۔" فخری نے دانت نکالے۔
میں بے تحاشا ہنس پڑی تو علی ایک دم بولا۔ "مت ہو نادان لڑکی! شاید انہوں نے یہ بات تمہارے ہی لیے کہی ہو۔"
اور ایک دم دل کے اندر بہت دور کہیں ایک ننھا سا دیا جل اٹھا۔ میری اپنی سرکش سوچ کے سارے رخ اس سمت گھوم گئے۔ جہاں ہر راستے پر میجر جانِ عالم مجھے ایک منزل کی طرح نظر آنے لگے۔
ساری رات عجیب وحشت ناک انداز سے گزری۔ دن تو پہلے ہی بے قراری کا شکار ہو چکا تھا' اس سے پہلے کہ میں دل بے قرار کا حال شاعری کی زبان میں بیان کر سکتی۔ مجھے اپنی پیاری بہن صبا سکندر راجہ کے زار و قطار رونے کی اطلاع ملی۔ ویسے تو یہ ان کا پارٹ نام جناب تھا مگر اس وقت معلوم ہوا کہ انہیں جانِ عالم کی بالٹی پر گرنے والی بات بری لگ گئی ہے۔
"سمجھتا کیا ہے خود کو؟" وہ میرے تسلی دینے پر مجھ ہی سے پوچھ رہی تھی جبکہ میں جواب دینے سے قاصر تھی۔
"ارے وہ۔" علی نے وضاحت کی۔ "وہ تو اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔"
"کیا کہا؟" فخری دور سے بولی۔ "انجن ہیں۔"
ہمارے بے ساختہ قہقہوں کے درمیان صبا کے ہونٹ بھی مسکرانے لگے تو اظہر کو اس منافقت پر بہت غصہ آیا۔
"چل یار!" وہ علی سے کہنے لگا۔ "ابھی اس میجر کے بچے کو پکڑ کر لاتے ہیں۔ آکر ہماری بہن کو راضی کرے۔"
"شرم کرو کچھ۔" علی نے غالباً" کچھ اور ہی مطلب لیا۔ "ویسے بھی میں اس وقت ڈرائیونگ نہیں کر سکتا۔ میرا پٹھا چڑھا ہوا ہے۔"
"تمہارا یہ پٹھا بھی تو نرا الو کا پٹھا ہے۔"
اظہر جل کر بولا۔
اسی وقت فخری نے ان کی توجہ دوسری جانب مبذول کرواتے ہوئے سیز فائر کی کوشش کی۔ "یہ ڈائننگ روم کا پنکھا کیوں چل رہا ہے؟"
اس نے عرشی سے پوچھا۔
"درجۂ حرارت کم کرنے کے لیے۔" اس کا جواب تھا۔
"کمرے کا؟"
"نہیں' اپنا۔" اس نے آنکھ کے بیرونی گوشے سے صبا کی طرف اشارہ کیا جو اس وقت نیل پالش کھرچتے ہوئے جانے کس جہان میں کھوئی ہوئی تھی۔
دوپہر کے کھانے پر کیانی کا فون آیا۔ انہوں نے شام کو ہمیں مدعو کیا تھا۔ تفصیل یہ بتائی کہ آج گالف کا میچ ہے۔ اگر دیکھنا چاہو تو ٹھیک' ورنہ وہ ہمیں منگلا قلعے کی سیر کروانا چاہتے تھے۔
تین بجے سے جو تیاری شروع ہوئی تو سوا چار بج گئے۔ اظہر نے سرلہ سنگھار ایجاد کرنے والوں کو کئی ایک بے نقط سنائیں۔ علی نے کچھ نہ کہا' صرف

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

شرارت سے گنگناتا رہا۔ ”روپ کے خزانے پہ ہے سیاں جی کا پہرہ۔“

باہر آتے ہی ایک خاص بات پر صبا سے میری جھڑپ ہو گئی۔ اصولوں کی بات آڑے آئی تو اپنے اصولوں پر کسی قسم کی سودا بازی نہ کرتے ہوئے میں نے جانے سے انکار کر دیا اور بطورِ احتجاج باتھ روم میں بند ہو گئی۔ اظہر اور علی مجھے اپنی جان کا واسطہ دے کر باہر آنے پر مجبور کرتے رہے' مایوس ہو کر چلے گئے۔

میں باہر آئی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ گرما کا سورج غروب ہونے والا تھا اور سرو کے درخت کے طویل سائے بھی بیرونی دیوار کے اوپر ایک نقطے کی صورت میں سمٹ چکے تھے۔ نواب ماموں اپنے چیف صاحب کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ صمد بابا نے مجھے حیرت سے دیکھا اور پھر جلدی سے لیمن اسکوائش بنا کر لے آئے۔ میں نے پہلا سپ لیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میجر جانِ عالم لائن پر تھے۔

”آپ کیوں نہیں آئیں؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔“ بلا ارادہ ہی میں نے کہہ دیا۔

”بہت زیادہ فرق پڑتا ہے۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں۔“

”کیا؟“ میں اور کچھ نہ کہہ سکی۔

جواب میں خاموشی رہی۔

”میں آپ کو لینے آ رہا ہوں۔“ شاید بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا گیا تھا۔

”ہرگز نہیں۔“ میں خوف زدہ ہو گئی۔ ”بھلا لوگ کیا کہیں گے۔“

”یہی کہ اس جن کو یہ پری کہاں سے مل گئی۔“

اور میں جسے ایسا اظہارِ تعریف کبھی پسند نہ تھا' جانے کیوں بغیر مائنڈ کیے ہنس پڑی۔ شاید اس لیے کہ کچھ جذبے کسی اصول کے پابند نہیں ہوتے مگر میں نے کہہ ہی دیا۔

”سوری میجر صاحب! ہماری بے تکلفی صرف اپنے کزنز تک محدود ہے۔ ہم لوگ دوسروں کے ساتھ اتنی بے تکلفی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”دوسروں کے ساتھ نہیں' غیروں کے ساتھ کہیے۔“ ان کی آواز عجب رنگ اختیار کر گئی۔

”خواہ مخواہ ہیرو بن رہا ہے۔“ میں نے سوچا اور میجر جانِ عالم نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

رات تک مجھے یہ خیال پریشان کرتا رہا کہ کچھ بھی سہی' مجھے اس سے کم از کم اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ کسی غافل لمحے میں اس کا خیال کچھ اس طرح میرے دماغ پر چھا گیا تھا کہ اگر میں چاہتی بھی تو اسے نظر انداز کر دینا شاید مشکل تھا۔

ساڑھے آٹھ بجے نواب ماموں واپس آئے اور مجھے اس طرح تنہا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ انہیں واپڈا کالونی میں کسی کے ہاں ڈنر پر جانا تھا۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ وہ ان تمام کو میری بے پناہ اہمیت کا احساس دلانے کے لیے پہلے مجھے ان کے پاس ڈراپ کریں گے اور بعد ازاں اپنے دوست کی جائے قیام کو رونق بخشیں گے۔

اب اس طرح ان کے پیچھے جانا برا سہی مگر مسئلہ نواب ماموں کی ضد کا تھا جو اس طرح تنہا چھوڑ کر جانا نہ چاہتے تھے۔ ہم لوگ قلعے پر پہنچے تو وہ سب ہماری آمد سے بے خبر منگلا جھیل کے سفید پانی کو ہلکی روشنی میں دیکھتے ہوئے صدقے واری جا رہے تھے۔ صبا کی نظر سب سے پہلے ہم پر پڑی اور ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ علی اور اظہر دوڑ کر نیچے اترے اور باقاعدہ مجھ سے پوچھا گیا کہ آیا میں اسی طرح اوپر تشریف لے جاؤں گی یا خدانخواستہ اکیس توپوں کی سلامی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ پھر جب میں نے سب کے پیچھے جانِ عالم کو آتے دیکھا تو اس لمحے کی اہمیت کا احساس کرنا پڑا۔ جو اڑتے بادلوں اور فضا کی ساری دلکشی کے سنگ ایک احساس' ایک کسک اور ایک امنگ دے کر رخصت ہو گیا تھا اور ہاں' اس لمحے میں اعتراف کی اس منزل سے گزر گئی کہ واقعی مجھے وہ شخص بہت بھلا لگا تھا کیونکہ اس وقت میرا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

”کیا پئیں گی آپ؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔

”گرائپ واٹر۔“ علی نے جواب دیا تو وہ بے تحاشا مسکرانے لگے۔

اسی وقت اظہر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

”اخاہ۔“

”کیا ہوا؟“ کیانی نے ذرا تشویش سے پوچھا۔

”وہ یاد آ گئی؟“

”کون؟“ صبا کا سوال تھا۔

”حوری۔“ اس نے اداکاری کر کے نام لیا۔

”حوری نہیں۔“ علی نے بتایا۔ ”میتھی قصوری۔“

”آپ لوگ تو بہت دلچسپ ہیں۔“ جان عالم نے بے ساختہ داد دی۔

”خاص طور پر کون ہے؟“ علی نے پوچھا اور جانِ عالم کی نظریں مجھ پر ٹک گئیں۔ ہاں' وہ مجھے ہی تو دیکھ رہے تھے اور میں ایسی نظروں کا مفہوم سمجھتی تھی۔

”شکر ہے تم آ گئیں۔“ فخری مجھے کہہ رہی تھی۔ ”ورنہ ہم سے زیادہ لوگوں کو تمہاری فکر تھی۔“

کیانی نے اس فقرے پر بڑے غور سے فخری کو دیکھتے ہوئے کچھ سمجھنے کی کوشش کی اور ایک دم مسکرا دیے۔

مہپل دے سے نیچے اترتے ہوئے کیانی کی منگیتر اور ماموں زاد نغمہ کا ذکر آیا جو کہ بہت جلدی ان کی زندگی کے ساز پر بجنے والا تھا تو جانِ عالم نے تقریباً درخواست کے لہجے میں کہا کہ براہِ کرم کیانی کی شادی پر انہیں ضرور بلایا جائے۔

”شہ بالا بننے کا شوق ہے؟“ فخری نے شرارت سے کہا۔

”تو فکر نہ کر۔“ کیانی نے مذاقاً کہا۔ ”یہ شادی میں اس وقت ہو گی' جب تو اپنی یونٹ سمیت ایکسرسائز کے لیے پہاڑ پر ٹنگا ہو گا۔“ واپسی پر وہ لوگ جان بوجھ کر ہمیں چھوڑنے آئے۔ حالانکہ اب تک ہم اپنی آوارہ گردی کے باعث نہ صرف یہ کہ میرپور کے راستوں سے بخوبی واقف ہو چکے تھے بلکہ جڑی ڈیم کا علاقہ دریافت کر چکے تھے۔

پھر ایک حسین سلسلے کا آغاز ہوا۔ کچھ شب و روز کی کیفیت بدلی۔ کچھ دل کی بے قراریوں کا عجب ہی عالم رہنے لگا اور کیانی کے ساتھ اب جانِ عالم بھی ہمارے درشن کو باقاعدگی سے آنے لگے۔ نواب ماموں کے ساتھ راشد کو بھی یہ بات ذرا کھٹک گئی۔ انہوں نے ان کی آمد کا برا تو نہ مانا تھا مگر میں جانتی تھی کہ اس طرح ان کا ہر بار کیانی کے ساتھ چلے آنا انہیں پسند نہ تھا۔ جانے مجھے کیوں یہ احساس ہوا کہ جانِ عالم کو بھی اس بات کا احساس ہو چلا تھا لیکن پھر بھی وہ ضرور آتے تھے۔

آخر کس لیے؟

یہ سوالیہ نشان وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد ان دنوں میری اپنی زندگی کی گردش جاری تھی۔ میں ان احساسات سے عاری تو نہ تھی' تاہم ان دنوں میں بہت عجیب قسم کی سوچوں میں گھری رہتی۔

ساون کی وہ زرد دوپہر تھی' جب جانِ عالم کا فون آیا اور انہوں نے کانپتی ہوئی آواز میں بتایا کہ عزیزم کیانی لو لگ جانے کے باعث بسترِ علالت پر دراز ہیں۔ اب جس کا جتنا جتنا خون کا رشتہ تھا' اس کو اتنا ہی زیادہ احساس ہوا اور بغیر کسی مناسب تیاری کے روانگی ہوئی اور جب ہم سارے نظاروں کو انجوائے کیے بغیر وہاں پہنچے تو کیانی بستر پر لیٹے تھے اور جانِ عالم صاحب پریشانی کے عالم میں سرہانے بیٹھے تھے۔ لگتا تھا بس ابھی رو دیں گے۔

”بی بریو۔“ (بہادر بنو۔) اظہر نے کیانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خاص ڈاکٹروں والے انداز میں تسلی دی۔ ”جیو تو اس احساس کے ساتھ کہ میں۔۔۔“

”عاشق ہوں۔“ علی نے لقمہ دیا اور میجر جانِ عالم ہنسنے لگے۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ”کم اِن“ کی اجازت کے بعد ایک صاحب اندر تشریف لائے۔

”کیا حال ہے سر؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اب ٹھیک ہیں۔“ اظہر نے جواب دیا جبکہ کیانی نے مزید بیماری کی بے مثال اداکاری کی۔

ان پورے بائیس دنوں میں انہیں ”سر“ کہنے والا یہ پہلا شخص تھا کہ بقول فخری کے اپنے پیارے بھائی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی اس عزت افزائی پر بے اختیار قربان ہونے کو جی چاہا۔

موصوف چند منٹ رکے اور غالباً "لڑکیوں کا سامنا نہ کرسکنے کی بنا پر جلدی پلٹ گئے۔

"یہ کون تھا؟" صبا نے حسبِ عادت سوال کیا۔

"کوارٹر ماسٹر۔" کیانی نے بتایا۔

"ہیں۔ کوارٹر ماسٹر۔" اظہر حیرت سے بولا۔ "فل ماسٹر کیوں نہیں؟"

"لگتا ہے افسر ہے۔" یہ فخری کی رائے تھی۔

"کوارٹر ماسٹر سو فیصدی اصلی افسر ہوتا ہے۔" کیانی نے وضاحت کی۔ "تم لوگ اتنا بھی نہیں جانتے۔"

"دراصل کسی مناسب چھاؤنی سے دور رہ کر یہ حال ہوگیا ہے۔" علی ذرا شرمندگی سے بولا۔

"اس لیے مناسب یہی ہے۔" یہ لقمہ دینے والا اظہر تھا۔ "کہ انہیں باعزت طور پر کسی چھاؤنی میں بیاہ دیا جائے۔"

"سب کچھ جان جائے گا۔" کیانی ایک دم ہنس دیے۔

میں اے سی کی حبس زدہ فضا سے باہر تازہ ہوا میں آئی تو ایک سایہ میرا تعاقب کرتا ہوا برآمدے کے آخری کونے میں رُک گیا۔ یہ میجر جان عالم تھے۔

"آپ صبا ہیں نا؟" انہوں نے غیر متوقع طور پر پوچھ لیا۔

"مگر آپ؟ آپ نے کس طرح جان لیا؟" میں نے شرارت سے پوچھا۔

"قدرت نے آپ کو یہ واضح انفرادیت بخشی ہے۔" ان کا اشارہ اس تل کی طرف تھا جو اس وقت بس ذرا سا لو نیک پہن لینے کے باعث شاید واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ بلاشبہ وہ نہایت دور رس نگاہوں کے مالک تھے۔ ایسی غیر مبہم حقیقت کو تلاش کرنا آسان بات تو نہ تھی۔ میں نے کچھ نہ کہا لیکن اس انکشاف پر کہ وہ میری ذات کی یہ انفرادیت پہچانتے ہیں۔ ایک مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر سمٹ گئی۔

جانِ عالم بھی مسکرا کر صرف مجھے دیکھتے رہے۔

دوسری بار جب وہ نواب ماموں کے ہاں آئے تو میں نے اونچے کالر کی قمیص پہن رکھی تھی اور سوئے اتفاق کہ صبا بھی ہلکی ملانی بنی دوپٹہ لپیٹے شرمانے والے اسٹائل میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی جبکہ روانگی سے پہلے پکنک کا پروگرام بن رہا تھا تو میں نے اس شخص کی بے قراری کو بہت محسوس کیا۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر آج دونوں کی کوئی واضح پہچان نہ تھی۔

وہ لمحے بے قراری سے گزرے اور اس شب میں نے محسوس کیا کہ ویسی ہی بے قراری کی کیفیت اپنے اندر بھی سمٹ آئی ہے۔ وہ زندگی کی پہلی شب تھی جبکہ نیند کے بجائے میں سوچ کی بے کراں اور اتھاہ گہرائی میں اتر گئی۔ فخری کی ناسازیٔ طبع کی بنا پر پکنک کا آخری پروگرام ملتوی کرکے ہمیں واپس آنا پڑا۔ جہلم کے ریلوے اسٹیشن پر ایرکنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں سوار ہونے سے پہلے میں نے سنا۔ وہ صبا سے کہہ رہے تھے

"ہمیں یاد رکھیے گا۔"

میرا دل ایک دم کانپ اٹھا جبکہ ادھر بے شمار دھنک رنگ میری بہن کے چہرے کو گلنار کر گئے۔ ہمیں الوداع کہہ کر وہ کیانی کے ہمراہ واپس چلے گئے۔

اپنے گھر واپس پہنچی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہی شہر تھا وہی سڑکیں، ویسی ہی فضا تھی اور وہی بے حد مانوس سا "نشاط ہاؤس" مگر ہما سکندر راجہ اب وہ نہ تھی۔ مجھے اس شخص کا خیال پہروں ستایا کرتا۔ ان دنوں کیانی کی شادی کا پروگرام بن رہا تھا۔ لہٰذا ہر بات میں ان کا ذکر بھی ضرور آتا۔ یہاں تک کہ باقی ماندہ چھٹیاں بھی ختم ہوگئیں۔ اظہر واپس چلا گیا اور علی نے مجھے اداس دیکھ کر یہ ریسرچ شروع کردی کہ آخر اس اداسی کا سبب کیا ہے؟

ان ہی دنوں جبکہ کیانی کی شادی کے دن مقرر ہونے والے تھے۔ میجر جانِ عالم کے گھر سے کچھ مہمان آئے۔ چونکہ مہمانوں کی آمد روز کا ایک معمول تھی۔ لہٰذا یہ جانے بغیر کہ یہ کون لوگ ہیں؟ میں نے کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔

اظہر اس دوپہر ویک اینڈ پر آیا تھا۔ میں لان میں بیٹھی "MID NIGHT DREAMS" پڑھ رہی تھی۔ فخری اور ثروت بنچ پر دراز یہ لائحہ عمل مرتب کررہی تھیں کہ شادی کے لیے سلوائے گئے جوڑے کب، کس وقت اور کہاں زیب تن کیے جائیں گے کہ اچانک ستمبر کی اس دوپہر میں تیز برفیلی ہوائیں میرے وجود کے آرپار ہوگئیں۔

"ارے سنو۔" اظہر حسبِ عادت چلایا۔ "وہ تھے نا ساری دنیا کی جان۔ انہوں نے پروپوز کیا ہے۔"

"کسے؟" فخری نے چونک کر پوچھا۔

"محترمہ صبا سکندر راجہ کو۔" علی نے کان پر ہاتھ رکھ کر اذان بلند کرنے والے انداز میں کہا۔

دل کے اندر بہت دور ایک دم ہی اندھیرا چھا گیا۔

"اچھا ہے۔" فخری مسکرا کر بولی۔ "وصل کی شب اسلحہ کی زبان میں گفتگو ہوگی۔"

میں نے سارے دکھ سمیٹ لیے۔ قصور بھی تو اپنا ہی تھا نا۔

اس مشترکہ خاندان میں دونوں شادیاں ایک ساتھ سرانجام پائیں۔ کیانی کا ولیمہ تھا اور صبا کی بارات آئی۔ میں نے جانِ عالم کو سالیوں والے انداز میں خوش آمدید کہا۔ اپنی انفرادیت کا نشان چھپائے ہنس ہنس کر ان سے نیگ وصول کیا۔ جب صبا سکندر راجہ ان کے ہمراہ رخصت ہوئی تو میرا دل ڈوب چکا تھا۔

کتنی مدت تک میں اپنے حواسوں میں ہی نہ رہی، سب ہی سمجھتے رہے کہ مجھے اپنی جڑواں بہن کے بچھڑنے کا دکھ تھا۔ ہاں دکھ تو ضرور تھا مگر جانِ عالم۔ وہ کیسی شبِ وفا تھی؟ جب دل کے آسمان پر وفا کے تارے جگمگائے تھے اور وہ کون سی شبِ اعتراف تھی؟ جب اپنی محبت کا انمول خزانہ دل کے گہرے سمندر سے نکال کر میں نے تمہارے قدموں میں ڈھیر کردیا تھا؟ تم صبا سمجھ کر مجھے چاہتے رہے اور میں ہما بن کر تمہاری پرستش کرتی رہی مگر اتنا نہ بتا سکی کہ میں وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔

بس یہی تو وہ بات تھی کہ مجھے تمہاری زندگی سے کوسوں دور نکل کر جانا پڑا۔ اب بھی جب ساون کا موسم آتا ہے تو یادوں کی برسات چھما چھم برسنے لگتی ہے۔ یادیں تو بڑی ظالم ہوتی ہیں نا۔ اس برستے ساون کا ہر قطرہ ایک نئی چوٹ لگا دیتا ہے اور میں سوچنے لگتی ہوں۔ کاش کہ میں تمہیں بتا دیتی کہ شاید میں وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔

مگر ایک احساس باعثِ طمانیت ضرور ہے کہ تم نے برملا اظہارِ محبت تو نہ کیا تھا؟ حالانکہ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں، کوئی دکھ نہیں جانِ عالم، مگر جانے کیوں یہ احساس، یہ خیال میری ذات کے اندر رچ بس گیا ہے کہ وصل کے کسی ایک لمحے میں تم نے ایک بار تو چونک کر یہ ضرور پوچھا ہوگا۔

"صبا! تمہارے شانے کا وہ سیاہ تل کہاں کھو گیا؟"

●

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے معروف ناول

* دل پھولوں کی بستی — نگہت عبداللہ — 400/-
* جو چلے تو جاں سے گزر گئے — [illegible] — 150/-
* وہ جنبلی سی دیوانی سی — [illegible] — 400/-
* فاتر لاہول — رفعت سراج — 550/-
* ایمان اُمید اور محبت — عمیرہ احمد — 180/-

اور

* خواتین کا گھریلو انسائیکلو پیڈیا — 600/-

خوبصورت سرورق، آفسٹ پیپر، خوبصورت چھپائی، دیدہ زیب مضبوط جلد

شائع ہوگئے ہیں

سنٹرل ایجنسی
مکتبۂ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار کراچی

لاہور میں
• لاہور اکیڈمی • سلطان نیوز ایجنسی
• عظیم اینڈ سنز • اسلامیہ کتب خانہ

راولپنڈی میں
اشرف بک ایجنسی
کمیٹی چوک، راولپنڈی

حیدرآباد میں
مہران نیوز ایجنسی

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY